

مهر
شهریار

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



فہرستِ مضامین

خطبہ مبارکہ تطنجیہ ۱

خطبہ مبارکہ افتخار ۴

خطبہ مبارکہ مفاخرہ ۷

خطبہ مبارکہ نورانیت ۱۰

خطبہ مبارکہ الوسیلہ ۱۴



اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى فَاطِمَةَ زَيْنَبٍ بِمَا رَقَّ قَلْبُكَ مِنْهَا
وَالْمِسْرَ الْمَسْنُورَةَ بِمَا بَعَثَ مَا لَهَا طَرَفُكَ

یہ تحریری نسخہ جس کا نام "مہر شہیار" ہے، ایک جامع مضمون کا خلاصہ اور تلخیص ہے۔ اس میں امیر المؤمنین علیہ السلام کے نورانی خطبات (خطبہ مبارکہ تطنجیہ، خطبہ مبارکہ افتخار، خطبہ مبارکہ مفاخرہ، خطبہ مبارکہ نورانیت، اور خطبہ مبارکہ الوسیلہ) کے منتخب اقتباسات کی مستند اور مکمل شرح، درست حوالوں اور ماخذ کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

اس نسخے میں امیر المؤمنین علیہ السلام کے خطبات کے ان حصوں کی تفصیل اور تشریح کی گئی ہے جن کا آغاز ضمیر منفصل انا میں سے ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خطبات کا تعارف اور منتخب اقتباسات کی تشریح، قرآن کریم کی آیات، ائمہ اطہار علیہم السلام کی احادیث و روایات، اور علمائے کرام، فقہاء اور حکماء کے گراں قدر بیانات و کتب کے حوالوں کے ساتھ، انتہائی سلیس اور شیریں انداز گفتگو میں بیان کی گئی ہے۔

خطبہ مبارکہ تطنجیہ

مرحوم حافظ رجب برسی نے اپنی کتاب مشارق انوار الیقین میں امیر المؤمنین (علیہ السلام) سے منسوب ایک خطبہ نقل کیا ہے جو خطبہ تطنجیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس خطبہ کا نام 'تَطْنِجْ' (خلج کے معنی میں) سے لیا گیا ہے۔ بعد میں بعض علماء نے اس خطبے کی طرف توجہ کی اور اسے المجموع الرائق، الذریعہ اور الشافی فی العقائد و الاخلاق و الاحکام جیسی کتب میں بھی نقل کیا ہے۔ اس خطبہ میں، حضرت علی (علیہ السلام) اپنے کچھ فضائل اور لمبے علمی احاطہ (گھیرے) کا ذکر کرتے ہیں؛ اور اپنی ذات کے بارے میں ایسی حقیقتوں سے پردہ اٹھاتے ہیں جو سننے والے کو حیران کر دیتی ہیں اور عام عقول کے لیے ان کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ اس خطبہ کے مختلف حصوں میں سے جو حصہ زیادہ اہم ہے اور سوال کا موضوع بنا ہے، وہ یہ عبارت ہے:

«أَنَا الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ»

"میں ہی اول ہوں، اور آخر ہوں، اور ظاہر ہوں، اور باطن ہوں"

«میں اول، آخر، ظاہر اور باطن ہوں»، پہلی نظر میں یہ چاروں اسمائے الٰہی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے منسوب کیے گئے ہیں، اس لیے انہیں امیر المؤمنین (علیہ السلام) سے منسوب کرنے کے لیے وضاحت کی ضرورت ہے۔

«أَنَا الْأَوَّلُ» (میں اول ہوں) کی شرح میں سب سے پہلے میثاق الٰہی کے مسئلے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

سورہ اعراف کی آیت ۱۷۲ میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اور ان کے بعد آنے والے بارہ اماموں سے عہد لیا تھا۔ نیز، جب اس نے ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) کی ندا دی، تو سب سے پہلے ﴿قَالُوا بَلَىٰ﴾ (ہاں، آپ ہی ہمارے رب ہیں) کہنے والے رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ، امام علی (علیہ السلام) اور ائمہ معصومین تھے۔ پس علی ہی 'اول' ہیں، وہ پہلے شخص ہیں جن سے عہد لیا گیا اور جنہوں نے روایت الٰہی کو تسلیم کرنے میں سبقت حاصل کی۔

ایک اور مقام پر، جیسا کہ خود حضرت فرماتے ہیں:

«أَنَا الْأَوَّلُ فَأَنَا أَوَّلُ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَأَسْلَمَ»

(میں اول ہوں، پس میں اللہ پر ایمان لانے والا اور اسلام قبول کرنے والا پہلا شخص ہوں)، تو آپ کا 'اول' ہونے کا مطلب اللہ اور اسلام پر سب سے پہلے ایمان لانا قرار دیا گیا ہے۔

«انا الآخر» (میں ہی آخر/آخری ہوں)، پہلے معنی میں رجعت (دنیا میں دوبارہ واپس آنے) اور آئمہ علیم السلام کے ظاہری سفر کے اختتام کے مسئلے سے متعلق ہے۔ جہاں آپ کو «آخری شخص جس کی روح قبض کی جائے گی» کے طور پر یاد کیا گیا ہے، اور بعض تفاسیر میں یہ سورہ نمل کی آیت ۸۳ کے حوالے سے بیان ہوا ہے:

«وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا»

(اور اس دن ہم ہر امت میں سے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے)؛

یہ وہ دن ہے جب قتل ہونے والے مومنین رجعت کریں گے تاکہ (طبعی طور پر) وفات پائیں، اور کوئی بھی شخص رجعت نہیں کرے گا سوائے خالص مومن یا خالص مشرک کے۔ رجعت کے وقت آپ کے پاس ایک عصا (لاٹھی) اور میسم (نشان لگانے والا آلہ) ہوگا جس کے ذریعے آپ حق اور باطل میں تمیز کریں گے۔

«وَمَعَكَ مِيسِمٌ تَسِمُ بِهِ أَعْدَاءَكَ»

(اور آپ کے پاس میسم ہوگا جس سے آپ اپنے دشمنوں پر نشان لگائیں گے)۔ مزید برآں، دوسرے معنی میں آپ کا آخر ہونا اس لحاظ سے ہے کہ آپ آخری شخص تھے جنہوں نے پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ) سے ملاقات کی اور آپ کے جسد اطہر کو دفن کیا۔

«أَنَا الْآخِرُ فَأَنَا آخِرُ مَنْ سَجَّى النَّبِيِّ نَوْبَهُ وَدَفَنَهُ»

(میں ہی آخر ہوں، پس میں ہی وہ آخری شخص ہوں جس نے نبی پر چادر ڈالی اور آپ کو دفن کیا)۔



لیکن انا الظاہر وانا الباطن کی تشریح میں بنیادی محور علم ہے۔ امیر المومنین (علیہ السلام) نے بارہا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جو معارف سکھائے گئے، وہ آپ (پیامبر) کی تعلیم کے ذریعے آپ (علیہ السلام) کے سینے میں محفوظ ہو گئے۔ اسی لیے آپ فرماتے ہیں:

«سَلُونِي قَبْلَ أَنْ تَفْقِدُونِي، هَذَا سَفْطُ الْعِلْمِ هَذَا لُعَابُ رَسُولِ اللَّهِ هَذَا مَا زَقْنِي رَسُولُ اللَّهِ زَقًّا، فَاسْأَلُونِي فَإِنَّ عِنْدِي عِلْمَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ»

آپ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ اس علم سے مستفید ہوں جو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لعاب دہن کے ذریعے آپ کے سینے میں اتارا گیا ہے۔ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ جب تک موقع ہے اور یہ انمول موتی ان کے درمیان موجود ہے، تب تک سوال پوچھیں کیونکہ اولین اور آخرین کا علم آپ ہی کے پاس ہے۔

پس آپ "ظاہر" ہیں کیونکہ وحی کے علوم آپ پر ظاہر اور آشکار ہیں؛ اور "باطن" ہیں کیونکہ پیغمبر کے اسرار آپ کے باطن میں جاگزیں ہیں۔

ان چاروں اسماء (اسماء الہی) میں سے ہر ایک جب امیر المومنین (علیہ السلام) سے منسوب ہوتا ہے، تو اس کا معنی اس مفہوم سے مختلف ہوتا ہے جو خدا کی ذات سے منسوب ہوتا ہے۔ جو شخص بھی ان معانی کے ذرا سے حصے کو سمجھنے کے لیے تشنہ لب ہو اور غور و خوض کرے، وہ اپنے مولا سے قریب ہو جاتا ہے؛ اور جو شخص ان اسماء کے محض ظاہری معنی پر نظر ڈالے اور فوراً اسے غلو (حد سے بڑھنا) قرار دے، وہ ایسے عظیم معارف کی وسعت سے محروم رہ جاتا ہے۔

خطبہ مبارکہ افتخار

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے برجستہ اور نورانی خطبات میں سے ایک "خطبہ افتخار" ہے، جو شیعہ اور اہل سنت کی حدیثی اور کلامی کتب میں خاص مقام رکھتا ہے۔ یہ خطبہ مشارق انوار الیقین، اللوامع النورانیہ، محبقات الانوار، نفحات الانوار، الزام الناصب، در المنقظم اور ینابیع المودۃ جیسے متعدد ذرائع میں نقل ہوا ہے۔

"افتخار" کا لفظ "فخر" سے نکلا ہے جس کے معنی مناقب اور فضائل کو ظاہر کرنے کے ہیں۔ چونکہ اس خطبے میں امیر المومنین اور اہل بیت علیہم السلام کے نورانی مقامات کو واضح اور فخر آمیز انداز میں بیان کیا گیا ہے، اس لیے یہ اسی نام سے مشہور ہو گیا۔

یہ خطبہ اہل بیت علیہم السلام کے مقاماتِ نورانی اور امامت کے شؤون کے علاوہ، توحیدی و ولائی معارف اور امت کے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی خبروں پر مشتمل ہے۔

«أَنَا الْبَيْتُ الْمَعْمُورُ، أَنَا السَّقْفُ الْمَرْفُوعُ، أَنَا الْبَحْرُ الْمَسْجُورُ»

"میں بیتِ معمور (آسمانی کعبہ) ہوں، میں بلند و افراشتہ چھت ہوں، اور میں موجیں لاتا اور بھڑکا ہوا سمندر ہوں۔"

«سیتِ معمر» آسمان میں ایک مقدس اور محفوظ مقام ہے، جہاں فرشتے ہمیشہ اس کا طواف کرتے اور اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔ اسی لیے یہ «معمر» (آباد) ہے اور اسے عبادت گاہ اور رحمتِ الہی کی تجلی گاہ کے طور پر جانا جاتا ہے۔

«سقفِ مرفوع» (اونچی چھت) جو کائنات کے اوپر ایک گنبد کی طرح قائم ہے اور اس پر مکمل احاطہ اور تسلط رکھتی ہے، احکاماتِ الہی کے نازل ہونے اور فرشتوں کے ٹھہرنے کا مقام ہے۔ یہ چھت بندوں کے اعمال کے درج ہونے کی گواہ اور عدلِ الہی کی بنیاد پر تقدیر کے فیصلوں کے نافذ ہونے کا ذریعہ ہے۔

«بحرِ مسجور» (جوش مارتا ہوا سمندر) عرش کے نیچے اللہ کا ایک بے کراں سمندر ہے؛ ایک ایسا سمندر جس میں کائنات کے بہت سے معاملات کی تقدیر اور تدبیر طے پاتی ہے، اور اسے زندگی کا چشمہ اور دوسرے سمندروں کا منبع (شروع ہونے کی جگہ) مانا گیا ہے۔



اس بنیاد پر، حضرت مولانا امیر المؤمنین علی (علیہ السلام) «بیتِ معمور» کی حقیقی شکل، آسمان والوں کی ہدایت کا مرکز، ان کے اجتماع کا محور، اور رحمتِ الہی کا مظہر ہیں؛ اور خدا کی بنگی آپ کی ولایت کے سائے میں ہی کمال تک پہنچتی ہے۔ اسی لیے روایات میں آپ کی مثال کعبہ ہدایت کی طرح دی گئی ہے جس کی طرف (لوگوں کو خود) جانا چاہیے۔ آپ کا ذکر، اللہ کی عبادت ہے، اور آپ کی ولایت، اللہ کا وہ مضبوط قلعہ (حصنِ حصین) ہے جس نے پوری کائنات پر الہی امن کا سایہ پھیلا رکھا ہے۔

اسی وجہ سے، بعض روایات کے مطابق، «سقفِ مرفوع» کا تعلق نجفِ اشرف کے نورانی گنبد سے جوڑا گیا ہے۔ یہ تعلق ظاہر کرتا ہے کہ جو حقیقت عالمِ ملکوت (آسمانی دنیا) میں «سقفِ مرفوع» ہے، وہی عالمِ ملک (ظاہری دنیا) میں حضرت امیر المؤمنین علی (علیہ السلام) کے نورانی گنبد کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ اس امامِ مسبین کا دوسرا جلوہ «بحرِ مستور» ہے، یعنی الہی فیض کا بے کراں سمندر، علم و حیات کا چشمہ، اور کائنات میں پروردگار کی تقدیر اور مشیت کے جاری ہونے کا ذریعہ؛ ایک ایسا سمندر جو فیض سے لبریز اور نور سے روشن ہے، جس کی لہروں نے پوری کائنات کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور بندوں کی معمولی زندگی اس سے جڑنے ہی سے جاری ہوتی ہے۔ جیسا کہ منابع (حوالہ جات) میں آپ کے وجودِ مقدس کو تمام علم پر محیط (الْمُحِيطُ بِجَوَامِعِ عِلْمِ الْكِتَابِ) اور ہدایت کا سرچشمہ (الْإِمَامُ الْمَاءُ الْعَذْبُ عَلَى الظَّمَاءِ وَالْهُدَى) مانا گیا ہے۔ اور یہ سب، امام کی معرفت کے اس بے کراں سمندر سے ابھرا ہوا صرف ایک قطرہ ہے؛ ایک ایسا سمندر جس کا صرف ایک گھونٹ چکھنے کی ہی ہم میں طاقت ہے اور جس کی گہرائی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

اگرچہ ان کی مدح و تعریف میں الفاظ نہیں سما سکتے (سخنِ گنجائش نہیں رکھتا)، پھر بھی میں اپنی بساط اور امکانی حد تک (مشکل سے ہی سعی) بیان کر رہا ہوں۔ دونوں جہاں ان کے رخِ انور کا ہی ایک جلوہ (روشن کرن) میں، میں نے تمہیں ان کا ظاہر اور باطن (سب کچھ) بتا دیا ہے۔



خطبہ نورانی مفاخرہ

اہل بیت (علیہم السلام) کی سیرت میں «مفاخرہ» (ایک دوسرے پر فضیلت بیان کرنا) دراصل معصومین (علیہم السلام) کے وجودی مقام و مرتبہ کی پہچان اور وضاحت کے لیے ہے۔ اس کی سب سے کامل اور بلند ترین شکل ہمیں حضرت امیر المؤمنین (علیہ السلام) اور ان کی واحد کفو (برابری کرنے والی) حضرت صدیقہ طاہرہ (سلام اللہ علیہا) کے باہمی فضائل کے بیان میں ملتی ہے، جہاں انہوں نے اپنے وجود کی ذات کی طرف بلا واسطہ اشارہ کرنے کے لیے ضمیر "اُنّا" (میں) کا استعمال فرمایا۔ اسی وجہ سے یہ خطبہ، خطبہ مبارکہ مفاخرہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک ایسا نورانی خطبہ ہے جو ایک ایسی انلی محبت کا گواہ ہے جس کے نورانی محور پر ابد تک ہر مقدس محبت اپنے معنی پاتی ہے۔ متعدد ذرائع (منابع) جن میں یہ خطبہ نقل ہوا ہے، ان میں سے اہم ترین کتابوں جیسے شاذان بن جبرئیل کی "کتاب الفضائل" اور بحرانی اصفہانی کی "عوامل العلوم و المعارف" کا نام لیا جاسکتا ہے۔

حضرت امیر المؤمنین (علیہ السلام) نے فرمایا:

«أَنَا الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْحَكِيمُ» (میں مثنائی اور قرآن حکیم ہوں)۔

متعدد تفاسیر میں اس جملے کی شرح کے سلسلے میں لفظ "مثنائی" کے لغوی مفہوم کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں: بار بار دہرایا گیا، دو دو، ثنا و تعریف، اور کسی چیز کے دونوں اطراف کا ایک دوسرے کی طرف مائل ہونا۔

اس نورانی جملے «أَنَا الْمَثَانِي» کی شرح میں، ہم مثنائی کے تین معانی اور ان کے مصداق (مثالوں) کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ قرآن کا ظاہر اور باطن:

لفظ مثنائی قرآن کے پہلوؤں یعنی اس کے ظاہر اور باطن کے ایک ساتھ ہونے پر دلالت کرتا ہے؛ اور امیر المؤمنین (علیہ السلام) قرآن کی ظاہری تنزيل بھی ہیں اور باطنی تاویل بھی، جیسا کہ آپ نے خود فرمایا: "میں ہی اول و آخر، اور ظاہر و باطن ہوں"۔

۲۔ قرآن کا عدیل (برابر/ساتھی):

مثنائی کا دوسرا معنی برابر اور ساتھی ہونا ہے۔ سورہ زمر کی آیت ۲۳ کی تفسیر میں امام باقر (علیہ السلام) کے کلام کے مطابق، "مثنائی" کی حقیقت سے مراد امام کے وجود مقدس کا قرآن کے ساتھ ساتھی ہونا ہے، جو قیامت تک کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے «لَنْ يَفْتَرِقَا حَتَّىٰ يَرِدَا عَلَيَّ الْخُوضَ» (یہ دونوں ہرگز جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس وارد ہوں)۔ امیر المؤمنین (علیہ السلام) امامت کی اصل اور جوہر ہیں اور آپ قرآن کا نقل (گرانقدر سرمایہ) ہیں، اور یہ «أنا المثنائی» کا دوسرا معنی ہے۔

۳۔ امّ الکتاب:

نصوص (روایات) میں "سبع المثنائی" سے مراد سورہ مبارکہ حمد ہے؛ اسی لیے بہت سی احادیث میں معانی کے تبادلے (ظاہری مفہوم) کے تحت "مثنائی" کا اطلاق "سبع المثنائی" یعنی اسی سورہ حمد پر ہوتا ہے۔ اور امیر المؤمنین (علیہ السلام) جنہیں مستندات میں "امّ الکتاب" کی حقیقت اور "باء کے نیچے نقطہ" (نقطۂ تحت الباء) کے طور پر متعارف کروایا گیا ہے، وہ اس سورہ کی حقیقت اور نتیجے کے طور پر پورے قرآن کی اساس و بنیاد مانے جاتے ہیں؛ اور یہ «أنا المثنائی» کا ایک اور معنی ہے۔

«أنا القرآن الحكيم» (میں قرآن حکیم ہوں)

قرآن "حکیم" ہے کیونکہ یہ پائیداری، مضبوطی اور حکمت کا سرچشمہ ہے۔ چونکہ خداوند متعال نے قرآن کی محکم آیات کو "امّ الکتاب" کا نام دیا ہے اور امام صادق (علیہ السلام) نے بھی "محکمات" کی تفسیر امیر المؤمنین اور ائمہ اطہار (علیہم السلام) کے وجود مقدس سے فرمائی ہے، پس امیر المؤمنین (علیہ السلام) قرآن کی وہی محکم اور پائیدار حقیقت ہیں جن کے نور کے سائے میں دوسری آیات کی تفسیر اور تائید ہوتی ہے۔

نتیجہً، امیر المؤمنین (علیہ السلام) کا وجود مبارک قرآن کا ثقل اور اس کے ساتھی بھی ہیں، اور پورے قرآن کی اساس اور مجموعہ بھی ہیں (جو "انا المثنیٰ" کا مفہوم ہے)؛ اور وہ خود قرآن کی حقیقت اور اس کے محکمات کے مالک بھی ہیں، یعنی "اَنَا الْقُرْآنُ الْحَكِيمُ"۔

اور ہم آج اپنے زمانے کے امامِ حقی (امامِ وقت) کو—جو اسی علوی اور فاطمی محبت کا ثمر ہیں—اس طرح سلام پیش کرتے ہیں:

«السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا تَالِيَّ كِتَابِ اللَّهِ وَتَرْجُمَانَهُ...»

(سلام ہو آپ پر اے کتابِ خدا کی تلاوت کرنے والے اور اس کی ترجمانی کرنے والے)۔

امید ہے کہ آپ کے ظہور سے، صامت (خاموش) قرآن دوبارہ آپ کے وجود کے ذریعے حیاتِ نو پائے گا، جو کہ خود حقیقتِ قرآن کی آنکھوں کا نور ہیں؛ اور ہم ماثور (منقولہ) دعا کے مطابق، اس قرآنِ ناطق کے "نورِ سرمدی" (ہمیشہ رہنے والے نور) کا نظارہ کر سکیں گے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا:

اے دلہا! آپ کی زبان سے قرآن کی آواز سننا کتنا بھلا لگتا ہے؛

آپ کے رخِ انور کا نظارہ کرنا اور خدا کا کلام سننا کتنی بڑی سعادت ہے۔

خطبہ نورانی نورانیت

حضرت امیر المؤمنین (علیہ السلام) کا خطبہ «نورانیت» اہم ترین اور بلند ترین خطبات میں سے ہے، جسے «معرفۃ الہام بالنورانیۃ» اور «خطبۃ النورانیۃ» کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ خطبہ شیعہ اور عامہ (دوسرے مکاتب فکر) کی حدیثی اور کلامی کتب میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ مختلف کتابوں جیسے "مشارق انوار الیقین"، "نحار الانوار"، "المناقب"، "الزام الناصب"، علامہ میرجانی کی "ولایت کلیہ" اور ملا باوی سبزواری کی تصانیف میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس خطبے میں آپ کے دو خاص اصحاب، جناب سلمان اور جناب ابوذر، آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور آپ کی نورانیت کے ذریعے معرفت کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔

حضرت نے فرمایا: «مَعْرِفَتِي بِالنُّورَانِيَّةِ مَعْرِفَةُ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ مَعْرِفَةُ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ مَعْرِفَتِي بِالنُّورَانِيَّةِ» یعنی "میری نورانیت کے ساتھ معرفت ہی اللہ عزوجل کی معرفت ہے، اور اللہ عزوجل کی معرفت ہی میری نورانیت کے ساتھ معرفت ہے"۔ یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ معرفتِ امام ہی دراصل معرفتِ خدا ہے۔

اس خطبہ شریف کے ایک حصے میں امیر المؤمنین (علیہ السلام) فرماتے ہیں:

«أَنَا الْحَاقَّةُ، أَنَا الْقَارِعَةُ، أَنَا الْغَاشِيَةُ»

(میں ہی حاقہ ہوں، میں ہی قارعہ ہوں، میں ہی غاشیہ ہوں)۔

یہ تینوں الفاظ قرآن کریم کی مبارک سورتوں کے نام ہیں۔

«أَنَا الْحَاقَّةُ»:

لفظ "الحاقۃ" کی اصل (ریشہ) "حق" ہے، جس کے معنی ایک ثابت اور یقینی امر (بات) کے ہیں۔ یہ لفظ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے، کیونکہ قیامت ایک حتمی اور سچی حقیقت ہے۔ سورہ حاقہ میں ارشاد ہوتا ہے: «الْحَاقَّةُ مَا الْحَاقَّةُ» اور «وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ» (وہ

سچی حقیقت! کیا ہے وہ سچی حقیقت؟ اور آپ کو کس چیز نے بتایا کہ وہ سچی

حقیقت کیا ہے؟)۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ قیامت کی معرفت وحی کے علاوہ کسی اور راستے سے ممکن نہیں۔ شیعہ کے گرانقدر منابع (روایات)، قرآن پاک کی آیات اور اہل بیت (علیہم السلام) کی احادیث میں "حق" کا حقیقی مصداق حضرت امیر المؤمنین (علیہ السلام) کی ذات ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

«علی مع الحق و الحق مع علی» (علی حق کے ساتھ ہیں اور حق علی کے ساتھ ہے)۔
 "یوم حاقہ" (قیامت کے دن) تمام حساب کتاب آپ کی ولایت کی بنیاد پر ہوگا اور "حق" سب پر آشکار (واضح) ہو جائے گا۔ امیر المؤمنین (علیہ السلام) حق کا مطلق (کامل اور غیر مشروط) معنی ہیں۔

اس موعود دن (وعدہ کیے گئے دن) جب تمام صفیں حساب و کتاب کے لیے تیار ہوں گی، حضرت صدیقہ کبریٰ (سلام اللہ علیہا) محشر میں قدم رکھیں گی اور مخلوقات کو حکم دیا جائے گا کہ «غضوا ابصارکم» (اپنی نگاہیں نیچی کر لو)۔ یہ وہ وقت ہوگا جب اس حق کا حساب لیا جائے گا جسے غضب کیا گیا تھا، اور امیر کائنات، جو اس عظیم حق کے مالک ہیں، اللہ کی بارگاہ میں سب سے پہلے دادخواہی (انصاف کی طلب) کریں گے؛ اپنے حق پر، اس ظلم پر جو فدک غضب کرنے والوں نے ان کی شہیدہ ہمسر (زوجہ) پر روا رکھا، مظلوم حضرت محسن بن علی (علیہما السلام) کی شہادت پر، اور ان تمام حقوق پر جو اس کھلے ظلم اور عظیم مصیبت کے بعد ضائع کیے گئے۔ ایسے حق کو جھٹلانے والوں کے لیے "حاقہ" ایک دردناک اور ہولناک عذاب ہے۔

«أنا القارعة» (میں ہی قارہ ہوں)

امیر المؤمنین خطبہ نورانیت میں فرماتے ہیں: میں ہی قارہ ہوں۔

سورۃ مبارکہ حاقہ کی آیت ۴ میں ارشاد ہوتا ہے: «كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ» (قوم ثمود اور عاد نے اس دل دہلا دینے والی آفت/قیامت کو جھٹلایا [اور اس کا عبرت ناک انجام دیکھا])



لفظ "قارِع" کی اصل "قرع" ہے، جس کے معنی کسی چیز پر زور سے مارنے یا کوٹنے کے ہیں۔
قیامت کے ناموں میں سے ایک نام "قارِع" بھی ہے۔

سورۃ مبارکہ قارِع میں ہمارے سامنے ہے: «الْقَارِعَةُ، مَا الْقَارِعَةُ، وَ مَا أَذْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ»
(وہ دل دہلا دینے والی آفت! کیا ہے وہ دل دہلا دینے والی آفت؟ اور آپ کو کس چیز نے بتایا کہ وہ دل دہلا دینے والی آفت کیا ہے؟)۔ اگلی آیت میں قارِع کے معنی واضح کیے گئے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے: اس قارِع کے دن، جس کی دہشت سے لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح اڑ رہے ہوں گے؛ حساب کتاب کیا جائے گا۔ «فَأَمَّا مَنْ تَقَلَّطَ مَوَازِينَهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ» (پس جس کے [اعمال کے] پلے بھاری ہوں گے، وہ دلپسند عیش میں ہوگا) اور «وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ» (اور جس کے پلے ہلکے ہوں گے، اس کا ٹھکانا ہاویہ [جہنم کی گہرائی] ہوگا)۔

امام باقر اور امام صادق (علیہما السلام) تفسیر میں فرماتے ہیں: «فَأَمَّا مَنْ تَقَلَّطَ مَوَازِينَهُ» سے مراد امیر المؤمنین (علیہ السلام) [اور ان کے ماننے والے] ہیں، اور «أَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ» وہ شخص ہے جس نے حضرت علی (علیہ السلام) کی ولایت کا انکار کیا، اور اس کا ٹھکانا آگ (جہنم) ہے۔ خطبہ نورانیت میں حضرت فرماتے ہیں: «من كان ظاهراً في ولايتي أكثر من باطنه خفت موازينه» (جس کا ظاہر میری ولایت میں اس کے باطن سے زیادہ [مضبوط] ہو، اس کے ترازو ہلکے ہو جائیں گے)۔ یہ کلام شریف علوی ولایت کے مرتبے اور شان کو بیان کرتا ہے کہ جو لوگ اس کی ذمہ داری سے منہ موڑیں گے اور ولایت کے منکر ہوں گے، ان کا کیا انجام ہوگا۔

آیات کے باطن (مفہوم) میں لفظ "ثمود" کا ایک معنی شیعیان کا وہ گروہ ہے جنہوں نے ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دی اور اپنے امام کو بھٹلایا۔ وہ قارِع اور کوسندہ (دل دہلا دینے والا) عذاب جو ان پر نازل ہوگا، وہ دراصل حضرت قائم (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کی تلوار (سیف)

ہے۔

«أَنَا الْغَاشِيَةُ» (میں ہی غاشیہ ہوں)

حضرت مولا امیر المؤمنین (علیہ السلام) اپنے خطبے کے ایک اور حصے میں فرماتے ہیں: میں ہی غاشیہ ہوں۔ لفظ "غاشیہ" بھی قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے، جس کے لغوی معنی اس پردے یا غلاف کے ہیں جو سب کو اپنے گھیرے میں لے لے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: «هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ» (کیا آپ کے پاس اس سب کو ڈھانپ لینے والی آفت [قیامت] کی خبر پہنچی ہے؟)۔ امام صادق (علیہ السلام) اس آیت کی وضاحت میں فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو امام کے مرتبہ کو چھپاتے ہیں اور سچے امام کے بجائے غیر (نااہل) کو منتخب کرتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ امام قائم (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) انہیں اپنی تلوار کے گھیرے میں لے لیں گے۔ جو لوگ ولایت کو قبول کریں گے، ان کے حالات بہترین ہوں گے اور جو منہ موڑیں گے، ظہور کے وقت قائم کی تلوار اور قیامت کے دن جہنم کی آگ ان کا نصیب بنے گی۔

حقیقتِ قیامت اور معاد (آخرت) سب امیر المؤمنین (علیہ السلام) کی ولایت میں ہی خلاصہ ہوتی ہے۔ خطبہ نورانیت کے مبارک جملوں کے مطابق، معرفتِ خدا، نبوت، صراط، میزان اور معاد کا اصل راز صرف اور صرف مولیٰ الموالی کی ولایت کے سائے میں ہی اپنے حقیقی معنی پاتا ہے۔ تمام بندوں اور آپ کے شیعوں کو چاہیے کہ وہ صامت قرآن (کتابِ خدا) اور ناطق قرآن (ائمہ اطہار) کے نورانی کلام میں گہرا تدبر اور غور و فکر کریں، تاکہ وہ ان خالص معارف کے حامل بن سکیں اور بنگی کی حقیقت اور اپنی خلقت کے اصل مقصد کو پالیں۔

خطبہ نورانی الوسیلہ

خطبہ «الوسیلہ» امیر المؤمنین علی بن ابی طالب (علیہ السلام) کے اہم ترین خطبات میں سے ہے، جس کا ذکر اور نقل شیعہ کے معتبر منابع (ذرائع) جیسے شیخ کلینی کی "الکافی"، "الوافی"، "نحر الانوار"، "مستدرک الوسائل" اور "الذریعہ" جیسی دیگر حدیثی و تفسیری کتب میں ملتا ہے۔ جابر بن یزید جعفی، جو کہ اہل بیت (علیہم السلام) کے قابلِ اعتماد (ثقف) راویوں میں سے ہیں، انہوں نے اس خطبے کو امام محمد باقر (علیہ السلام) سے روایت کیا ہے۔

یہ خطبہ مدینہ منورہ میں رسولِ اکرم (صلوات اللہ علیہ وآلہ) کی شہادت کے سات دن بعد ارشاد فرمایا گیا؛ یہ وہ وقت تھا جب اسلامی معاشرہ انحراف (بگاڑ) اور اختلاف کا شکار ہو چکا تھا، اور وہ خلافت جو نصِ نبوی (نبی کے واضح اعلان) کے مطابق امیر المؤمنین (علیہ السلام) کا حق تھا، غصب کر لی گئی تھی اور امت کا راستہ ولایتِ الہی سے بھٹک چکا تھا۔

ایسے ماحول میں، امام (علیہ السلام) نے حجت قائم کرنے اور امامت کے حقیقی مقام و مرتبہ کو واضح کرنے کے لیے لفظ "أَنَا" (میں) کے ساتھ اپنا تعارف کروایا؛ یہ وہ بیان ہے جو حقیقت میں پیغمبرِ اکرم (صلوات اللہ علیہ وآلہ) کی شہادت کے بعد پیدا ہونے والے انحراف کے مقابلے میں ہدایت کی سچی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔

رسولِ خدا کے فضائل اور ولایت کے قیام میں ان کے کردار کو بیان کرنے کے بعد، حضرت (علیہ السلام) خلافت کے غصب ہونے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں؛ یہ وہی ظلم ہے جو ابوبکر اور عمر (لعنت اللہ علیہما) نے روا رکھا اور جس کا انجام دنیا اور آخرت میں ایک دوسرے پر لعنت اور بیزاری کی شکل میں ظاہر ہوا:

«لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي...»

(یقیناً اس نے مجھے اس ذکر [نصیحت/حق] سے ہٹا دیا، اس کے بعد کہ وہ میرے پاس آپکا

تھا...)

اس کے بعد حضرت فرماتے ہیں:

فَأَنَا الذَّكْرُ الَّذِي عَنْهُ ضَلَّ

پس میں ہی وہ "ذکر" ہوں جس سے وہ بھٹک گیا۔

وَأَنَا السَّبِيلُ الَّذِي عَنْهُ مَالَ

اور میں ہی وہ "راستہ" ہوں جس سے وہ مڑ گیا۔

وَأَنَا الْإِيمَانُ الَّذِي بِهِ كَفَرَ

اور میں ہی وہ "ایمان" ہوں جس کا اس نے انکار (کفر) کیا۔

وَأَنَا الْقُرْآنُ الَّذِي إِيَّاهُ هَجَرَ

اور میں ہی وہ "قرآن" ہوں جسے اس نے چھوڑ (ترک کر) دیا۔

وَأَنَا الدِّينُ الَّذِي بِهِ كَذَّبَ

اور میں ہی وہ "دین" ہوں جسے اس نے جھٹلایا۔

وَأَنَا الصِّرَاطُ الَّذِي عَنْهُ نَكَبَ

اور میں ہی وہ "صراط" ہوں جس سے وہ دور ہٹ گیا۔

«فَأَنَا الذِّكْرُ الَّذِي عَنْهُ ضَلَّ»

"ذکر" سے مراد امیر المؤمنین (علیہ السلام) کی ولایت ہی ہے؛ یہ وہی حقیقت ہے جس کے ذریعے رسول اکرم (صلوات اللہ علیہ وآلہ) ہمیشہ لوگوں کو ڈراتے اور آگاہ کرتے تھے۔ رسول خدا کی اس تنبیہ سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جنہوں نے اس "ذکر" کی پیروی کی ہو۔ لیکن پہلے اور دوسرے (لعنت اللہ علیہما) نے لوگوں کو اس ذکر الہی سے گمراہ کیا اور اس کی جگہ کفر و ضلالت (گمراہی) کو رائج کر دیا۔

«وَأَنَا السَّبِيلُ الَّذِي عَنْهُ مَالَ»

یعنی میں ہی وہ راستہ ہوں جس سے وہ منحرف ہو گئے (منہ موڑ لیا)۔ پیغمبر اکرم نے بارہا حضرت امام علی (علیہ السلام) کو ہدایت کے واحد راستے کے طور پر متعارف کروایا تھا، لیکن انہوں نے سقیفہ کے واقعے اور حدیث قرطاس وغیرہ میں اس حقیقت کے سامنے رکاوٹ کھڑی کی اور لوگوں کو "سبیل اللہ" (اللہ کے راستے) سے منحرف کر دیا، جو کہ امیر المؤمنین (علیہ السلام) کی ولایت ہے۔

«وَأَنَا الْإِيمَانُ الَّذِي بِهِ كَفَرُ»

حقیقی ایمان، امام علی (علیہ السلام) کی محبت اور ولایت ہی ہے؛ جیسا کہ رسول خدا نے فرمایا: «حُبُّكَ إِيْمَانٌ وَ بُغْضُكَ كُفْرٌ» (آپ کی محبت ایمان ہے اور آپ کا بغض کفر ہے)۔ جنہوں نے ولایت کو پس پشت ڈال دیا، انہوں نے حقیقتِ ایمان کا انکار کیا اور ان کے اعمال ضائع (حبط) ہو گئے۔

«وَأَنَا الْقُرْآنُ الَّذِي إِيَّاهُ هَجَرَ»

یعنی میں ہی وہ قرآن ہوں جسے چھوڑ دیا گیا (مہجور کر دیا گیا)۔ رسول پاک (صلوات اللہ علیہ وآلہ) کی شہادت کے بعد، انہوں نے امیر المؤمنین (علیہ السلام) کا جمع کردہ مصحف (نسخہ قرآن) قبول کرنے سے انکار کر دیا، کیونکہ اس میں ولایت کے حقائق بالکل واضح تھے۔ قرآن کی تشریح کرنے والے اس اصل مرکز سے دوری اختیار کر کے اور حقیقتِ ولایت کو چھوڑ کر، عملاً

«علی مع القرآن و القرآن معہ» (علی قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی کے ساتھ ہے) کے رابطے کو نظر انداز کر دیا گیا، اور یہی عمل قرآن کو ترک کرنے اور اس کے حقیقی فہم سے جدا ہونے کا واضح مصداق بن گیا۔

«وَأَنَا الدِّينُ الَّذِي بِهِ كَذَّبَ»

یعنی میں ہی اللہ کے دین کی وہ حقیقت ہوں جسے جھٹلایا گیا۔ شروع ہی سے سقیفہ کا پورا نظام ولایت کے انکار کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، اور پہلے اور دوسرے نے درحقیقت اپنے شرک کے پس منظر اور ولایت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی وجہ سے اس دین کو دل سے قبول ہی نہیں کیا تھا، بلکہ اس کے خلاف مجاذہ کھڑا کیا اور اسے جھٹلایا۔ رسول اکرم (صلوات اللہ علیہ وآلہ) کی شہادت کے بعد بھی خلافت کو غصب کر کے اور امت کے راستے میں بگاڑ پیدا کر کے اس تکذیب (جھٹلانے) کو عملاً جاری رکھا گیا اور دین کو اس کی اصل حقیقت سے جدا کر دیا گیا۔ دین کو جھٹلانا دراصل ولایت کا انکار کرنے اور الٰہی ہدایت کی حقیقت سے باہر نکل جانے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

«وَأَنَا الصِّرَاطُ الَّذِي عَنْهُ نَكَبَ»

امام علی (علیہ السلام) اپنے آپ کو "صراطِ مستقیم" (سیدھا راستہ) متعارف کرواتے ہیں؛ یہ وہی راستہ ہے جس کی پیروی کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے اور وہ امرِ ولایت ہی ہے۔ یہ صراط، ہدایت کے سفر کا تسلسل اور امت کے اتحاد کا اصلی محور ہے۔ لیکن پیغمبر اکرم کی شہادت اور غدیر کے واقعے کے بعد، لوگ اس راستے سے — جو کہ خداتک پہنچنے کا واحد راستہ ہے — پھر گئے اور گمراہی و انحراف کا شکار ہو گئے۔

تمام الٰہی حقائق جیسے کہ:

ذکر، سبیل (راستہ)، قرآن کریم، ایمان، دین، صراط اور ہدایت، سب کے سب امیر المؤمنین (علیہ السلام) کی ولایت ہی سے معنی پاتے ہیں۔ یہ وہی ولایت ہے جو کربلا کے میدان میں اپنے پورے کمال کے ساتھ ظاہر ہوئی اور حضرت بقیۃ اللہ (ارواحنا له الفداء) کے ظہور مبارک سے پوری دنیا میں نافذ و برقرار ہوئی۔

اللَّهُمَّ عجل لوليک الفرج

(اے اللہ! اپنے ولی کے ظہور میں تعجیل فرما)

اللَّهُمَّ عجل لمولانا المظلوم الفرج

(اے اللہ! ہمارے مظلوم مولا کے ظہور میں تعجیل فرما)

اللَّهُمَّ عجل لمولانا الغریب الفرج

(اے اللہ! ہمارے غریب مولا کے ظہور میں تعجیل فرما)

اللَّهُمَّ عجل لوليكَ الفرج

اللَّهُمَّ عجل لمولانا المظلوم الفرج

اللَّهُمَّ عجل لمولانا الغريب الفرج

اللَّهُمَّ عجل لمولانا الفريد الفرج

اللَّهُمَّ عجل لمولانا الطريد الفرج

الزمان

عجل الله تعالى
فرجه الشريف